اس قصہ کے واقعات اللہ تعالیٰ سے توراۃ حاصل کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمراہ ان کی قوم کے ستّر آدمیوں کے سفر کے لیے نکلنے سے شروع ہوتے ہیں، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم پر جانشین حاکم بنایا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات ومناجات کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ وہ اپنے رفقاء واصحاب سے پہلے مقرّرہ جگہ پر پہنچ گئے، رب سبحانہ نے (جاننے کے باوجود) ان سے عجلت کی وجہ معلوم کی تو انھوں نے جواب دیا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا وخوشنودی کے شوق ورغبت میں جلدی ہوگئی! ظاہر ہے کہ یہ سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توراۃ حاصل کرنے اور اپنی قوم سے دور چالیس دن کی مدت گذارنے کے بعد کا ہے جب کہ انھوں نے ان کو ایک ماہ دور رہنے کے لیے کہا تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ سفر پر نکلنے کے بعد اس نے ان کی قوم کو ابتلاء وآزمائش میں اس وقت ڈال دیا ہے جب کہ سامری نے ان کو اپنے ہاتھوں سونے کے زیورات سے بنائے ہوئے بچھڑے کی پوجا کے لیے یہ بتا کر دعوت دی کہ یہ ان کا اور موسیٰ کا اِلٰہ (معبود) ہے اور یہ آزمائش قوم موسیٰ علیہ السلام کے بیش تر لوگوں کی گمراہی کا سبب بن گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جیسے ہی قوم کا حشر معلوم ہوا فوراً واپس آئے، ان کو قوم کی اس حرکت پر افسوس اور غصہ تھا، ان پر لعنت ملامت کی اور اللہ کی مہربانی سے ان کی فرعون اور اس کے لاؤلشکر سے نجات اور اللہ کا بہترین وعدہ یاد دلایا، اور ان کی اس حرکت کی برائی بیان کرتے ہوئے ان سے پوچھا: کیا اتنا زمانہ گذر گیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کا عہد بھول گئے؟ یا تمھیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب کے نازل ہونے کی خواہش ہوئی، اس لیے اللہ کے حکم کی پابندی اور حق واطاعت پر ثابت قدمی کے مجھ سے کیے گئے وعدہ کی خلاف ورزی کی؟ اس پر ان کی قوم نے ایک دوسرے پر الزام رکھ کر ذمہ داری سے فرار اختیار کرتے ہوئے عذر گناہ بدتر از گناہ سے کام لیا اور کہا: آپ سے اطاعت کے وعدہ کی خلاف ورزی ہمارے اختیار اور مرضی سے نہیں ہوئی، بلکہ مصر سے ناحق لائے ہوئے سونے

وزیورات پر ہم کو احساسِ گناہ ہوا تو سامری نے ان سے نجات کی یہ ترکیب بجھائی کہ ان کو ایک جگہ جمع کرنے سے تم کو ان سے اور ان کے گناہ دونوں سے نجات مل جائے گی، پھر اس نے خود بھی یہی کیا کہ اپنے پاس کے سب زیورات ایک طرف ڈال دیے تو ہم نے بھی اس کی پیروی کی، ہم کو یہ تو معلوم نہیں تھا کہ سامری کا ارادہ نیک نہیں ہے، پھر اس نے ان زیورات سے بچھڑے کے شکل کی مجسّم مورتی بڑی خوبی اور کاریگری سے بنائی، اور اس میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے ایسے سوراخ رکھے جن سے بچھڑے کی آواز آتی تھی، پھر اس نے دعویٰ کیا کہ یہی بچھڑا موسیٰ اور بنی اسرائیل کا اِلٰہ ہے مگر موسیٰ یہ بھول گئے اس لیے اس کو تلاش کرنے دوسری جگہ چلے گئے، ہم نے تو صرف سامری کی بات مانی اور اس کی پیروی کی، مگر ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ بچھڑا محض سونے سے بنی ہوئی ایک مورتی ہے جو بولتا ہے نہ نفع نقصان پہنچاتا ہے، پھر ان کی آنکھیں کیسے پتھرا گئیں اور دل کیسے اندھے ہو گئے کہ وہ باقاعدہ اور باصرار اس کی پوجا پاٹ میں لگ گئے، حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام نے نصیحت کرتے ہوئے ان کی گمراہی کی قباحت اور مورتی کے ناقابل عبادت ہونے کی خوب وضاحت بھی کی تھی اور بتایا تھا کہ عبادت کا مستحق صرف اور صرف اللہ رحمٰن و رحیم ہے، لیکن انھوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کی بات سنی مگر نہ قبول کی، بلکہ گمراہی میں مبتلا رہے، اور حضرت ہارون علیہ السلام سے بدکلامی الگ کی کہ وہ تو اس وقت تک بچھڑے کے گرویدہ بنے رہیں گے جب تک کہ خود موسیٰ علیہ السلام آ کر حق واضح نہ کریں گے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق اصلاح کی کوشش کی، خیر کی دعوت دی اور باطل پر خاموش نہیں رہے، لیکن واپس آنے پر موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام پر غصہ کیا، قوم کو گمراہی سے باز نہ رکھنے اور منکر کو (بزورِ قوت) نہ بدلنے کا سبب پوچھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اتنے زیادہ بے قابو تھے کہ وہ کبھی بھائی کا سر گھسیٹتے، کبھی داڑھی اور کبھی دونوں! سراسیمہ و پریشان حضرت ہارون علیہ السلام نے بڑے بھائی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ماں جائی بھائی!

کے حوالہ سے لطف ومحبت کو جگا کر جواب دیا کہ اگر سختی سے بات کی جاتی اور بزور قوت روکا جاتا تو خطرہ تھا کہ قوم مؤید اور مخالف گروہوں میں بٹ جاتی، بعض لوگ لڑتے اور خون بہاتے تو آپ اس پر بھی مجھے ملامت کرتے اور مجھے الزام دیتے کہ آپ کی واپسی تک آپ کے حکم کی تعمیل میں قوم کی اصلاح وخیر خواہی میں کوتاہی کی، حضرت موسیٰ کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو بھائی کے جواب سے اندازہ ہوا کہ اختلاف و افتراق سے بچنے کے لیے انھوں نے نرمی کے رخ سے اصلاح کی پوری کوشش کی اور اس میں ناکامی کے بعد خود ان کی واپسی کا انتظار کیا کہ صورت حال مزید نہ بگڑنے پائے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو لعنت ملامت کی اور اس سے پوچھا: تم نے قوم کے ساتھ یہ کیا اور کیوں کیا؟ اس وقت سامری نے اپنے بغض وحسد اور بدطینتی کا علانیہ اظہار کرتے ہوئے کہا: اس کی طرف سے ان کی پیروی ایمان ویقین کے ساتھ نہیں تھی، وہ ان کے دین کو تھوڑا سا جاننے کے بعد کبھی کا چھوڑ چکا، اس نے اپنے خبث نفس اور بدکاری کی وجہ سے مورتیاں بنانے کا فن بنی اسرائیل کو فریب دینے کے لیے استعمال کیا، ان کے لیے بچھڑا بنا کر ان سے اس کی پوجا پاٹ، تعظیم واحترام اور اس پر جمے رہنے کے لیے کہا۔ خطرناک جرم اور برے عمل کا یہ کھلا اعتراف تھا! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے قوم میں عظمت و بڑائی حاصل کرنے کے مقصد کے برخلاف اس کے لیے موت تک جلاوطنی، دربدری اور بنی اسرائیل سے جدائی کی دردناک سزا تجویز کی کہ وہ لوگوں سے الگ رہے گا، ان کے قریب جائے گا نہ ان سے بات کرے گا، یہاں تک کہ ان سے دور ویرانہ میں اچھوت کی موت مرے گا؟ رہا آخرت کا عذاب تو وہ عظیم ترین اور خوف ناک والم ناک ہوگا جس سے نجات ممکن ہے نہ فرار! اور وہ اللہ کے مقرر کردہ وقت پر ہو کر رہے گا۔ جہاں تک نام نہاد الٰہ معبود بچھڑے کا تعلق تھا تو وہ خود جل کر مرا یا اس کو جلا کر اس کی ۲ راکھ کو سمندر میں بکھیر دیا گیا تا کہ اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے، اور سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ نہ معبود تھا نہ عزت واحترام وتعظیم کا مستحق ۳ بلکہ صرف ایک ڈھکوسلہ تھا!

بحث دوم: بنی اسرائیل کے معبود بچھڑے کی تحقیق

قرآن کریم کے متعدد قصوں اور آیات کی طرح سامری کے قصہ میں بھی کئی مسائل قابل تحقیق وتفتیش وترجیح ہیں[۴]، ان میں سے میرے نزدیک بچھڑے کی حقیقت جاننے کی زیادہ اہمیت ہے جس کو سامری نے بنایا اور بنی اسرائیل نے پوجا تھا، اس لیے زیرِ تحریر مقالہ میں اسی پر زیادہ بحث ہوگی، مگر اس سے پہلے موضوع سے متعلق دو تمہیدی مقدمے:

اول: سامری کا تعارف

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان متبعین میں تھا جو ان کے ساتھ مصر سے جان بچا کر نکلے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل میں کفر وشرک چھپا کر ایمان کا اظہار کرتا تھا، شاید وہ بنی اسرائیل کے بڑے لوگوں میں تھا اسی لیے اس کے نفاق کی دعوت اور ناپسندیدہ حرکتوں کے باوجود لوگوں نے اس کے سابق مقام ومرتبہ کی وجہ سے اس کا حکم مانا اور اس کی پیروی کی۔

اس کے نام ولقب کے بارے میں اختلاف ہے، کوئی اس کا نام سامری بتاتا ہے اور کوئی اسے لقب کہتا ہے، نام کے بارے میں تو یہاں تک اختلاف ہے کہ کسی نے اس کا نام موسیٰ بتایا تو کسی نے ہارون، ان دونوں کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے، بہر حال وہ نام ہو یا لقب، ہے عجمی۔ اس کے آخر کی یاء نسبت کی بھی ہوسکتی ہے یا اور کرسی ناموں کی طرح نام کا حصہ بھی، اور ہوسکتا ہے کہ اس شخص کی اصل سامرہ طائفۃ کی ہو جو ایک یہودی فرقہ ہے جس کی تعلیمات جمہور یہودیوں کے اعتقادات کے خلاف ہیں، لیکن اس کے اور یہودیوں کے شہر السامرۃ (فلسطین میں نابلس شہر کے قریب واقع) کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے، اس لیے کہ اس شہر کی تعمیر سامری کی ہلاکت کے صدیوں بعد ہوئی تھی[۵]۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ سامری عبری زبان کے ''شومیر'' کی طرف نسبت ہو جس کے

معنی حفاظت وحراست کے ہیں، اگر یہ نسبت صحیح ہے تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ کوئی بڑا کاہن رہا ہو جس کی وجہ سے اس کے لیے لوگوں کو متأثر کرنا آسان ہوا[۶]۔

دوم:

بعض مفسرین و مؤرخین اور قرآنی قصوں پر لکھنے والے مؤلفین نے ذکر کیا ہے کہ مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے بہت پہلے سے گایوں اور بچھڑوں کی پوجا موجود تھی، اور ان کے نزدیک بچھڑا طاقت اور بار آوری کی علامت تھا، اور قدیم حاکم خاندان کے بادشاہوں کی تصویریں بیل کی شکل وصورت کی ہوتی تھیں، اور مصر میں سونے کے بنے ہوئے یا سونے کی پالش کیے ہوئے قدیم مجسمے گائے کی شکل وصورت کے موجود ہیں[۷]۔ اس سے بنی اسرائیل کے لیے بچھڑے کے اختیار کرنے کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

معبود بچھڑے کے بارے میں اقوال کا جائزہ

۱- قبطیوں سے حیلہ کے ذریعہ زیورات ہتھیانے کے گناہ سے پاکی کے لیے سامری نے بنی اسرائیل کو وہ زیورات ایک گڈھے میں ڈالنے کے لیے کہا جس کو اس نے اس کام کے لیے کھودا تھا، انھوں نے وہ سب ڈال دیے تو اس نے آگ جلا کر ان کو جلایا، جب وہ سونے کا ایک ڈلّہ بن گئے تو اسنے جبرئیل کے پیر یا ان کے گھوڑے کے کھر کے نشان کی مٹھی بھر مٹی (جس کو اس نے فرعون کی ہلاکت کے وقت یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی میں چلتے ہوئے اٹھایا تھا) کو اس سونے کے ڈلے پر ڈال دیا، جس کے بارے میں اس کو خیال آیا تھا کہ کسی بھی بے جا چیز پر ڈالنے سے اس میں زندگی کی رمق دوڑنے لگے گی، پھر ہوا بھی ایسا ہی کہ وہ ڈلّہ گوشت پوست کا ذی روح زندہ بچھڑا بن گیا جس سے بیل کی آواز نکلتی تھی[۸]۔

۲- سامری نے سونے کے ڈلے پر جب مٹھی بھر مٹی ڈالی تو وہ بچھڑے کی شکل کا مجسمہ بن گیا، جس کے (بچھڑے کی) آواز تھی، مگر تھا بہر حال وہ مجسمہ، اگر چہ غیر معمولی

مجسمہ۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے سامری کے ہاتھ میں مٹھی بھر مٹی دیکھی تو اس سے کہا: یہ پھینک کیوں نہیں دیتے؟ سامری نے جواب دیا: یہ اس رسول (جبرئیل) کے نشان کی مٹی ہے جو سمندر پر تمھارے پاس سے گذرا تھا، اس لیے میں اس وقت تک اس کو نہیں پھینکوں گا جب تک تم اللہ سے دعا نہ کرو جب میں اس کو کہیں ڈالوں تو جو چاہوں وہ ہو جائے، چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا کی اور سامری نے ڈلے پر مٹی ڈال کر کہا: میں چاہتا ہوں کہ تو بچھڑا ہو جا، تو گڈھے میں جو کچھ سامان یا زیور یا لوہا یا تانبا تھا سب اکٹھا ہو کر کھوکھلا بچھڑا بن گیا، جس میں روح تو نہ تھی مگر بچھڑے کی آواز تھی۹۔

۳- بنی اسرائیل کے گڈھے میں سونا اور زیورات ڈالنے کے بعد سامری نے بہت مہارت اور خوبی سے بچھڑے کی شکل کا مجسمہ بنا کر اس کو بہت فنکاری سے اندر سے اس طرح خالی رکھا کہ جب اس میں ہوا داخل و خارج ہو تو اس میں سے بچھڑے کی آواز کے مشابہ آواز نکلے۱۰۔

۴- سامری نے بنی اسرائیل سے زیورات لیے نہ ان کو جلایا نہ ان کو گڈھے میں ڈالا بلکہ اس نے ایک ایسا بچھڑا دیکھا جو مصر میں پوجے جانے والے بچھڑوں کے مشابہ تھا تو اس کو اس کے مالک سے خرید لیا اور بنی اسرائیل کو اس کی پوجا کے لیے بلانے لگا۱۱۔

ان چاروں اقوال میں غور و فکر کے بعد میرے نزدیک قابل قبول تیسرا قول معلوم ہوتا ہے، ذیل میں اس کے راجح ہونے کے دلائل میں دیگر باقی اقوال کا رد بھی مضمر ہے:

۱- دونوں اول اقوال کی روایات کی تفصیلات و جزئیات میں تعارض ہے جیسے سامری کا بنی اسرائیل سے تعلق، اس کے نام، جبرئیل کو دیکھنے کا وقت اور مٹھی بھر مٹی اٹھانے کا مصدر و ماٰخذ۔

۲- ان دونوں اول اقوال پر یہ اشکالات بھی وارد ہوتے ہیں کہ تمام بنی اسرائیل کے برخلاف جبرئیل علیہ السلام کو خاص طور سے سامری ہی نے دیکھا، اور بچپنے

میں جب اس کی ماں کو فرعون کے سپاہیوں کی طرف سے سامری کے ذبح ہونے کا خوف ہوا تو اس نے اس کو ایک غار میں چھپا کر اس کا منھ بند کر دیا، جہاں جبرئیل علیہ السلام جا کر اس کو اپنی ایک انگلی سے دودھ، دوسری سے شہد، تیسری سے گھی کی غذا اس وقت تک دیتے رہے جب تک کہ وہ پال پوس کے پروان نہ چڑھا گیا! اب ان بیہودہ بے سرو پیر اسرائیلی خرافات کے معقولیت کے بارے میں کوئی بتائے کہ اس نافرمان گمراہ میں کیا امتیازی چیز تھی کہ صرف وہی ایک معزز و محترم فرشتے کو دیکھ سکے؟ اور اسی فرشتے کی خاص نگرانی میں اس کی پرورش ہو؟ اور پھر تنہا وہی اسی فرشتے کے نشانِ راہ سے جادوئی پڑیا اٹھا سکے؟ اور یہ سب کس لیے؟ اس لیے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کر کے خوب بھٹکائے !! اس روایت/متن وسند میں محدثین ومفسرین کا اختلاف ہے، روایت کے اعتبار سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں وارد باتیں سامری کے لیے استدراج اور اس کی قوم کے لیے ابتلاء وآزمائش تھیں! [۱۲]۔

۳- تیسرا راجح قول مؤرخین کی اس بات کے بھی موافق ہے کہ قدیم اہل مصر سونے سے بنائے ہوئے بچھڑوں کی تعظیم کرتے تھے۔

۴- اسی طرح تیسرا راجح قول قرآنی آیات کی بچھڑے کے لیے بیان کی ہوئی صفت جسد (جسم/مجسّمہ) کے بھی موافق ہے، اس لیے لفظ جسد کا اطلاق بغیر روح کے جسم پر ہوتا ہے [۱۳]۔ چنانچہ آیات قرآنی کے مطابق وہ منحوت، مصنوع، متقن، محکم مجسّمہ تھا جس میں سے بچھڑے کی آواز نکلتی تھی، اگر وہ زندہ حقیقی بچھڑا ہوتا تو لہ خوار (اس کے آواز تھی) کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، اس میں تعجب پیدا کرنے کے لیے بھی اس صفت کا استعمال زیادہ بہتر ہے، اس قول کو کئی مفسرین ومؤرخین وغیرہ نے راجح مانا ہے یا اوّلیت دی ہے، اور دیگر اقوال کو رد کیا ہے [۱۴]۔

بحث سوم: قصہ میں عبرتیں، نصیحتیں اور فوائد

سورہ طٰہٰ میں مذکور سامری کے قصہ میں کافی تعداد میں عبرتیں اور نصیحتیں ہیں، جو فائدے مجھے معلوم ہوئے انھیں میں بیان کرتا ہوں، ہوسکتا ہے دوسرے غور کرنے والوں

پر دیگر فوائد ظاہر ہوں، ذیل میں ان کا خلاصہ پیش ہے:

۱- قوم میں سے ایک ایسے امام یا قائد کا تقرر جو ان کے امور کی خبر گیری کرے، راست رابطہ میں رہے اور کسی خاص ضرورت کے علاوہ ان سے جدا نہ ہو۔ یہ فائدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان کی قوم کے ساتھ رفاقت سے ظاہر ہے جب وہ مصر سے روانہ ہوئے تھے، پھر وہ ایک مختصر مدت کے علاوہ کبھی ان سے جدا نہ ہوئے، مختصر مدت کی دوری میں بھی جو بہت سے واقعات پیش آ گئے ان کا اہم ترین سبب قائد کی اپنی رعایا میں غیر موجودگی ہی تھا۔

۲- اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کو فوراً قبول کر کے اطاعت کے لیے فوری اقدام۔ یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے ظاہر ہے: وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی۔ (طٰہٰ/۸۴) (آپ کی طرف آنے میں جلدی اے میرے رب! اس لیے کی تا کہ آپ راضی ہو جائیں)۔

۳- خبر گیری و نگہ داشت کے لیے سردار کا قوم کے پیچھے چلنے کا استحباب۔ یہ فائدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے سوال: وَمَا أَعْجَلَکَ عَنْ قَوْمِکَ یٰمُوْسٰی۔ (طٰہٰ/۸۳) (اے موسیٰ! تم نے اپنی قوم سے جلدی (پیش قدمی) کیوں کی؟) سے معلوم ہوتا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل چیز قوم کے پیچھے چلنا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو قوم کے پیچھے پیچھے چلنے کا حکم دیا: وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ (الحجر/۶۵) (اور ان کے پیچھے پیچھے چلو)۔ خود رسول اللہ ﷺ سفر میں پیچھے ہو جاتے تھے تو کمزور کی مدد کرتے، کسی کو اپنی سواری کے پیچھے ردیف (ہم سفر) بنا کر بٹھاتے اور سب کے لیے دعا کرتے [۱۵]۔

۴- جواب جاننے والے کا ذمہ دار (امام/قائد) سے امتحان یا آئندہ بات کی تمہید کے لیے سوال کا جواز۔ چنانچہ اللہ سبحانہ نے خوب جاننے کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جلد آمد کا سبب معلوم کیا (طٰہٰ/۸۳)، پھر یہی سوال ان کو یہ بتانے کی تمہید بھی بنا کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کی قوم نے سامری کے جھانسے میں آ کر کیا گل کھلائے!

۵- اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش یہ بتانے کے لیے کرتا ہے کہ وہ خوب جانتا ہے کون حق پر ثابت قدم رہے گا؟ اور کون اس سے منحرف ہوگا؟ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول سے نکلتی ہے: قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ... (طٰہٰ/۸۵) (فرمایا: ہم نے تمھارے بعد تمھاری قوم کو فتنہ میں ڈال دیا...)۔ انسان پر جو ابتلاء و آزمائش بھی پڑتی ہے وہ برے کو اچھے سے الگ کرنے اور اطاعت گذار و نافرمان میں فرق کرنے کے لیے آتی ہے!

۶- کسی تکلیف دہ خبر اور اسی طرح کسی بہت پریشان کن اہم بات کے اچانک معلوم ہونے کا صدمہ قدرتی ہوتا ہے، اپنی غیر موجودگی میں ان کی قوم کا حال معلوم ہو کر یہی کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی ہوا: فَرَجَعَ مُوسَى إِلَى قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفاً (طٰہٰ/۸۶) (پھر موسیٰ غصہ میں افسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کے پاس جلدی سے واپس ہوئے)۔ فاء فعل کے جلد واقع ہونے پر دلالت کرتی ہے اور آیت کریمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ اور افسوس کی حالت بتا رہی ہے۔ غضب: خوف کے بغیر اس نفسی انفعال و ہیجان کا نام ہے جو بری ناگوار خبر سن کر پیدا ہوتا ہے۔ اور أسف: مزاجی ناگواری کے ساتھ نفسی انفعال کا نام ہے جو ناپسندیدہ غمگین خبر سن کر پیدا ہوتا ہے[۱۶]۔

۷- خطا کار پر عتاب و سرزنش، اس کو اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی اور حق کے اظہار اور غلطی کے ازالہ کے لیے اس کے ساتھ گفتگو و مجادلہ کی مشروعیت۔ واپسی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ یہی کیا۔ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْداً حَسَناً أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُم مَّوْعِدِي (طٰہٰ/۸۶) (اے میری قوم! کیا تم سے تمھارے رب نے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ یا تم پر بہت زمانہ گذر گیا تھا؟ یا تم نے تمھارے اوپر تمھارے رب کے غضب کے نزول کو دعوت دی؟ اس لیے تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟)

۸- طویل زمانہ گذر جانے سے نعمت کی شکر گذاری میں بھول چوک اور منعم کی حمد و ثناء میں غفلت و اہمال ہونے لگتا ہے جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اللہ نے فرمایا: أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ (طٰہٰ/۸۶) (کیا تم پر بڑا زمانہ بیت گیا تھا؟)

۹- اللہ کے کسی بھی رسول علیہ السلام کی نافرمانی اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی گستاخی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے: أَمْ أَرَدتُّمْ أَن يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّكُمْ (طٰہٰ/۸۶) (یا تم نے اللہ کے غضب کو بلانا چاہا؟) اس مفہوم پر دلالت کرنے والے اور بہت سے نصوص ہیں۔

۱۰- تھوڑے گناہ سے فرار میں اس سے بڑے گناہ کے ارتکاب پر تنبیہ۔ بنی اسرائیل نے بعینہ یہی کیا کہ حیلہ سازی سے ہتھیائے ہوئے زیورات کے احساس گناہ نے ستایا تو اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس بڑے منکر: یعنی اللہ کے ساتھ شرک اور غیر اللہ (بچھڑے) کی پوجا میں ملوث ہوگئے اور بدعقلی اس انتہا کو پہنچی کہ کہنے لگے: فَقَالُوا هَذَا إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَى (طٰہٰ/۸۸) (یہ تمھارا اور موسیٰ کا معبود ہے)

۱۱- ذمہ داری سے فرار کے لیے دوسروں پر الزام کی قباحت۔ یہ عام عادت ہے، مجہول قراءت ۱۷ کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے یہی کیا: وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ (طٰہٰ/۸۷) (بلکہ قومِ فرعون کے زیورات کے بوجھ ہم پر لاد دیے گئے) گویا زیورات انھوں نے قبطیوں کو دھوکہ دے کر حیلہ سازی سے حاصل نہیں کیے تھے بلکہ کسی اور نے لاد دیے تھے! اس لیے نہ ان کی خطا ہے نہ ان پر لعنت ملامت ہونی چاہیے! مکاری کا یہ بھولا بھالا انداز انتہائی معیوب و مذموم ہے، اس سے ذمہ داری تو رفع نہیں ہوتی، ہاں بہانہ باز کی مکاری آشکارا ہوتی ہے۔

۱۲- کسی برے فعل کو زیادہ لوگ مل کر انجام دیں تو ذمہ داری بٹ جانے کی وجہ سے اپنے کو سزا سے محفوظ سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کے جواب میں سب نے مل کر بصیغۂ جمع حُمِّلْنَا ایک ہی جواب دیا، یعنی سب ذمہ داری اٹھانے اور سزا پانے کے لیے تیار ہیں، بعض معاملات میں کچھ لوگوں کے اس شعور کا مثبت اثر بھی ہوسکتا ہے، لیکن زیر بحث موقف میں احساس گناہ کو ہلکا کرنے کے لیے منفی اثر آشکارا ہے۔

۱۳- ناجائز غلط کام کرکے انسان میں احساس گناہ اور ضمیر کی چبھن پیدا ہوتی

ہے تو وہ خود کو ملامت کرتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے جیسے کہ مذکورہ آیت (طہٰ/ ۸۷) کی معروف قراءت حَمَلْنَا سے معلوم ہوتا ہے۱۸۔ بنی اسرائیل کے زیر بحث زیورات حاصل کرنے کی کیفیت کے بارے میں دو روایتیں ہیں:

اول: حضرت موسیٰ کے ساتھ نکلنے سے پہلے بنی اسرائیل نے عید کے بہانے یہ زیورات عاریتاً لیے تھے، بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے یہ کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم و اجازت سے کیا تھا، اور یہ ان کے لیے جائز کام تھا، اس لیے کہ انھوں نے سالہا سال بغیر عوض کے قبطیوں کی خدمت انجام دی تھی جس کے مالی حقوق قبطیوں پر باقی تھے، لہٰذا انھوں نے قبطیوں کے جو زیورات ہتھیائے وہ ان کے باقی حقوق کا کچھ معاوضہ شمار ہوا۱۹۔

دوم: فرعون اور اس کے حمایتیوں کے غرق ہونے کے بعد موجوں نے جو زیورات سمندر/ دریا کے کنارے پھینک دیے تھے، ان کو بنی اسرائیل نے اٹھا لیا تھا، مگر حدیث نبوی ﷺ کے مطابق ان کے لیے مال غنیمت حلال نہیں تھا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے لیے مال غنیمت حلال کیے گئے جب کہ مجھ سے پہلے وہ کسی نبی کے لیے حلال نہ تھے''۲۰۔

۱۴- انسان کو اپنے ذاتی اور اپنے آباء و اجداد کے عادات و اطوار سے لگاؤ ہوتا ہے، سامری نے اس کمزوری کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین کے لیے بچھڑا بنایا جس کو اہل مصر پرانے زمانہ سے مقدس سمجھتے اور اس کی تعظیم کرتے تھے۔

۱۵- بنی اسرائیل خاص طور سے مال و دولت اور سونا چاندی سے تعلق سامری کی اتباع کا طاقت ور ترین سبب تھا، اس لیے کہ وہ مادہ پرست قوم ہیں، ان کے ہاں مادہ ہر چیز پر حاوی ہو جاتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب کہ معاملہ سونا، زیور اور مال و دولت کا ہو، مادہ پسندی کی وجہ سے انھوں نے سمندر/ دریا پار کرتے ہوئے بت پرست اقوام کو ان کے بتوں پر ڈیرہ ڈالے ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے بھی محسوس معبود بنانے کی فرمائش کی تھی: قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَلْ لَنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ

(الاعراف/۱۳۸) (انھوں نے کہا: اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایسا ہی معبود بنا دیجیے جیسا کہ ان لوگوں کا معبود ہے) یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منتخب رفقاء بھی مادہ پسندی میں اپنی قوم سے کم نہ تھے، انھوں نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: لَن نُّؤمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھرَۃً (البقرہ/۵۵) (ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ کو کھلّم کھلاّ نہ دیکھ لیں)۔

۱۶- بنی اسرائیل کے اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام پر ایمان کی کمزوری اس بات سے عیاں ہے کہ وہ سامری کے پھندہ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر بلا تردد فوری پھنس گئے، حالانکہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں کا خود مشاہدہ کیا تھا، اور فرعون کے مکر وفریب اور سخت گرفت سے نجات دلا کر ان پر لطفِ خاص کیا تھا، مگر وہ ایک چھوٹے سے فتنہ کا مقابلہ نہ کر سکے، بلکہ فوری ارتداد اختیار کر کے بچھڑے کے مجسّمہ کی پوجا پاٹ میں لگ گئے اور اللہ اور اس کے رسول پر حقیقی ایمان سے ہاتھ جھاڑ لیے۔

۱۷- غیر اللہ کے پجاریوں سے مذاکرات اور واضح دلیل کے ذریعہ ان کے عقائد ورسوم کے بطلان کی اہمیت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی اس قرآنی دلیل سے واضح ہے: أَفَلَا یَرَوْنَ أَلَّا یَرْجِعُ إِلَیْھِمْ قَوْلاً وَلَا یَمْلِکُ لَھُمْ ضَرّاً وَلَا نَفْعاً (طٰہٰ/۸۹) (کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے معبودانِ باطل کوئی جواب دیتے ہیں نہ ان کے نفع نقصان کے مالک ہیں)۔

۱۸- غیر اللہ کے پجاریوں کی سادہ لوحی اس بات سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل سونے سے بنے ایک ایسے بچھڑے کی پوجا اور تعظیم میں پھنس گئے جو نہ بولتا تھا نہ ان کے نفع نقصان کا مالک تھا، محض ایک اچھا بنا ہوا مجسّمہ تھا جس میں سے زندہ گائے کے مشابہ آواز آتی تھی، حالانکہ وہ نہ زندہ تھا نہ حرکت وکلام وتاثیر پر قادر! اور اگر بعض لوگوں کے اس قول کو مان بھی لیا جائے کہ وہ مجسّمہ زندہ بچھڑا بن گیا تھا، تب بھی تو وہ جانور ہی خود اپنے آپ کے نفع نقصان سے عاجز! تو اس کی تعظیم وپوجا کا کیا سوال؟ اس طرح کی خرافات کو ماننے والوں کی عقلوں کو کیا ہوا ہے؟!

۱۹- امام وقائد یا اس کا نائب جب بھی قوم میں حق سے کوئی انحراف یا گمراہی دیکھے تو فوراً اسے فریضۂ نصیحت وتصحیح انجام دینا چاہیے جیسے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کیا: وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي (طٰہٰ/۹۰) (ہارون نے ان سے پہلے ہی کہا تھا: اس بچھڑے سے تم فتنہ میں پڑے ہو، تمھارا رب تو بے شک رحمٰن ہے، اس لیے میری اتباع کرو اور میری بات مانو!)۔

۲۰- داعی کو دعوت پیش کرنے میں مثالی راستہ اختیار کرنا چاہیے اور مقصود تک پہنچنے کے لیے مخاطبین کو تدریجی طور پر مطمئن کرنا چاہیے جیسے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کیا، انھوں نے پہلے بنی اسرائیل کو باطل سے متنبہ کیا: إِنَّمَا فُتِنتُمْ (بے شک فتنہ میں ڈالے گئے ہو)، دوم: اللہ سے آگاہ کیا: وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ (بے شک تمھارا رب رحمٰن ہے)، سوم: نبوت سے متعارف کرایا: فَاتَّبِعُونِي (اس لیے میری پیروی کرو)، چہارم: شریعت کی دعوت دی: وَأَطِيعُوا أَمْرِي (میرے حکم کی اطاعت کرو)، یہ بہترین ترتیب ہے: پہلے انھوں نے راستہ سے رکاوٹ دور کی، پھر شکوک وشبہات دور کیے، پھر اللہ کی معرفت کرائی جو کہ اصل ہے، پھر نبوت پیش کی، اس کے بعد شریعت بتائی![۲۱]

۲۱- اختلاف رفع کرنے کے لیے ایسے حَکَم کے انتخاب کی مشروعیت جس پر لوگ متفق ہوں اور اس کا فیصلہ مانیں: حَتَّى يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَى (طٰہٰ/۹۱) (یہاں تک کہ موسیٰ ہمارے پاس واپس آئیں)۔

۲۲- دونوں معزز رسولوں کے اسلوب دعوت اور اصلاح کے بہتر طریقہ میں اختلاف۔ ہارون علیہ السلام قوم کے ساتھ اپنے معاملہ کو بہتر اور زیادہ موزوں سمجھ رہے تھے، انھوں نے قوم کو اللہ کی یاد دلائی، اس کی اطاعت کی تلقین کی اور بچھڑے کی پوجا چھوڑنے کو کہا، لیکن جب ان کے تیوروں سے معلوم ہوا کہ وہ ایذا رسانی اور قتل پر آمادہ ہو سکتے ہیں اور اختلاف وتفرقہ میں دو برسرِ پیکار فریق بن جائیں گے تو ان کو اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت: وَاخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ (الاعراف/۱۴۲) (قوم میں میری جانشینی کرو، اصلاح پر عمل پیرا رہو اور فساد

پھیلانے والوں کا راستہ اختیار نہ کرو) یاد آئی اور اس پر عمل پیرا ہوئے اس لیے قوم نے اپنی ہٹ دھرمی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی پر موقوف کر رکھا تھا: قَالُوا لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ (طٰہٰ/۹۱) (ہم تو بچھڑے پر ڈیرہ ڈالے رہیں گے یہاں تک کہ موسیٰ واپس آئیں)۔ دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام کا اپنے بھائی ہارون علیہ السلام پر غصہ و مؤاخذہ اس لیے تھا کہ انھوں نے عین وقت پر آ کر ان کو خبر کیوں نہ دی کہ بر وقت اس فساد و بگاڑ کا تدارک ہوتا، لیکن جب ان کو حضرت ہارون علیہ السلام کی اصلاحی کوشش اور قوم کی سرکشی اور فتنہ کے قابو سے باہر ہونے کے احتمال کا علم ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اور بھائی دونوں کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کرنے لگے: قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ (الاعراف/۱۵۱) (انھوں نے کہا: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما دے)۔ اس واقعہ کے دو بنیادی کرداروں کے طرز عمل سے دعوت کے اسلوب اور طریق کار کے اجتہاد میں اختلاف کا سبق ملتا ہے۔

۲۳- غصہ اور جھنجھلاہٹ کی حالت میں انسان اپنے معمول کے خلاف کام کرتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی اس قصہ میں یہی ہوا، جب ان کو قوم کی سرکشی اور گمراہی کا حال اللہ تعالیٰ کی معرفت معلوم ہوا تو وہ ہاتھوں میں توراۃ کی تختیاں لیے ہوئے تیزی سے واپس ہوئے، وہاں بچھڑے کی تعظیم کا کربناک منظر دیکھ کر اتنا متأثر ہوئے کہ تختیاں ایک طرف ڈال دیں اور بھائی کا سر پکڑ کر گھسیٹنے لگے: وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ (الاعراف/۱۵۰)۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ شدید تأثر سے بے قابو نہ ہوئے ہوتے تو ان سے اس حرکت کا صدور ناممکن تھا، وہ اللہ اور اس کے دین کی سخت حمیت رکھتے تھے، قوم کو اللہ کے بجائے بچھڑے کی پوجا کرتے دیکھ کر بے قابو ہونا قدرتی تھا!۲۲

۲۴- سننے سے زیادہ کسی چیز کو دیکھ کر انسان متأثر ہوتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی جب اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کی گمراہی کی خبر دی تو حیرانی و پریشانی میں جلدی

جلدی واپس ہوئے، لیکن قوم کو بچھڑے کی پوجا اور تعظیم میں مبتلا دیکھ کر برا حال ہوگیا، بقول رسول اللہ ﷺ: ''خبر عینی مشاہدہ کی طرح نہیں ہوتی! اللہ عزّ وجل نے موسیٰ کو بچھڑے کے معاملہ میں قوم کے عمل کی خبر دی تو انھوں نے تختیاں نہیں پھینکیں، لیکن جب اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تو تختیاں گر کر ٹوٹ گئیں'' ۲۳۔

۲۵- اللہ اور اس کے دین کی غیرت وحمیت میں بے اختیارانہ کوئی نامناسب اقدام قابل معافی ہے، کلام اللہ پر مشتمل تختیوں کو گرادینا اور ایک نبی کا سر پکڑ کر گھسیٹنا عام حالات میں ناقابلِ قبول ہے، لیکن اللہ کے دین کے لیے غصہ میں کسی سے ایسی حرکت سرزد ہوجائے تو اس پر ملامت ہے نہ مؤاخذہ! ۲۴

۲۶- کسی خبر یا واقعہ سے متأثر ہوکر اپنے نفس کو قابو میں رکھنا اور سوچ سمجھ کر اقدام مستحب ہے تاکہ انسان سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر نہ ہو جس کو سکون واطمینان کی حالت میں وہ پسند نہیں کرتا، اور جس کو دیکھ کر دوسرے لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں، اس لیے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو پکڑا تو انھوں نے ان سے ان کو چھوڑنے کی گذارش کی تاکہ لوگوں کے ہنسنے، خوش ہونے اور مذاق اڑانے کا موقع نہ ملے: فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ (الاعراف/۱۵۰) (دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع مت دیجیے!)۔

۲۷- داڑھی بڑھانا فطری سنت کے علاوہ انبیاء کی سنت بھی ہے، آیت قرآنی میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑنے کا ذکر ہے ۲۵، جو انھوں نے غصہ کی حالت میں سرزنش و ملامت کے لیے کیا تھا، مفسرین نے اس حرکت کو اس طرح مانا ہے جیسے کہ انسان غصہ کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹتا ہے، اپنی انگلیاں مسکتا ہے اور اپنی داڑھی پکڑتا ہے، گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے مرتبہ میں رکھا، اور تھے بھی وہ ان کے بھائی اور شریک رسالت، اس لیے غصہ میں ان کے ساتھ بھی وہی کیا جو اپنے ساتھ کرتے، مگر سیاق وسباق سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ۲۶۔

۲۸- ماں کے رشتہ سے اخوت کی یاد دہانی کے ذریعہ لطف وکرم کی درخواست

باپ کے واسطہ سے گذارش سے زیادہ طاقت ور اور مؤثر ہوتی ہے، اسی لیے حضرت ہارون علیہ السلام نے: یـــا ابـن أم (طٰہٰ/۹۴) (اے میرے ماں جائی بھائی!) سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا تا کہ دل نرم پڑے اور نفس کو سکون ہو[۲۷]۔

۲۹- موقع ومحل کے لحاظ سے بوقت ضرورت داعی کی شدت وسختی سے گفتگو کی مشروعیت ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کی قوم کے ساتھ بات چیت اور گفتگو سے واضح ہے۔

۳۰- خبر اور غلطی کی وجہ معلوم کرنے میں تدریجی طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور اگر پہلے شخص سے صحیح جواب نہ ملے تو دوسرے سے پوچھنا چاہیے جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے اپنی قوم سے بات معلوم کی، مگر وہ بیوقوفی کی باتیں کر کے اور دوسروں کی ملامت کے ذریعہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے لگے، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے جانشین بھائی سے حالات اور خود ان کا موقف معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے، تب حضرت ہارون علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنا موقف واضح کیا، جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ زائل ہوا، تو خود اپنے اور اپنے بھائی کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کی، اس کے بعد اس حادثہ کے تیسرے بلکہ سب سے اہم کردار سامری کی طرف متوجہ ہوئے جس سے ان کی غیر موجودگی میں قوم کو گمراہ کرنے کی تمام تفصیل معلوم کر کے تصویر مکمل ہوئی اور حقیقت کا علم ہوا۔

۳۱- مخاطب کے مقام ومرتبہ کے لائق عزت و احترام سے بات نہ کرنا بداخلاقی ہے، چنانچہ سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نامناسب انداز میں بے توقیری کے ساتھ بات میں پہلے اپنی مدح سرائی کے بعد قوم پر اپنی فضیلت بیان کی: بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (طٰہٰ/۹۶) (میں نے وہ چیز دیکھی جو قوم نے نہیں دیکھی تو میں فرستادہ الٰہی (جبرئیل) کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی بھر لی، پھر اس کو سونے یا بچھڑے میں ڈال دیا، اس لیے کہ مجھے یہی بات سوجھی)۔ اگر لـم يبصروا کو لـم تبصروا کی قراءت [۲۸] کے مطابق

پڑھا جائے تو بات مزید بے ادبی کی ہوجاتی ہے۔ مزید افسوس ناک بات ہے کہ سامری کے جواب میں کہیں سے بھی اس شرم ناک اقدام پر کسی ندامت یا غلطی کے احساس کا پتہ نہیں چلتا!

۳۲- گناہ کے مطابق سزا کا انتخاب تاکہ غلط کار کو اس کے اس مقصد سے محروم کیا جائے جس کو اس نے غلط طریقہ سے حاصل کرنا چاہا ہے، سامری نے قوم کی قیادت کے ممتاز مقام و مرتبہ پر قبضہ کرنا چاہا تھا تو اس کے لیے اسی لحاظ سے یہ سزا تجویز ہوئی کہ اس کو قوم سے دور کر کے ذلیل و رسوا کیا گیا: قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ (طٰہٰ/۹۷) (موسیٰ نے کہا: دور ہوجا! تیری سزا یہ ہے کہ تو زندگی بھر یہی کہتا رہے: ہٹو بچو، مجھے نہ چھوؤ!)۔

۳۳- شرک کے اثرات کو مٹانا اور کفر کے اسباب کو زائل کرنا واجب ہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بجائے جس بچھڑے کی عبادت کی گئی تھی اس کا انجام یہ ہوا کہ اس کو جلا کر راکھ کر کے دریا برد کر دیا گیا: وَانظُرْ إِلَىٰ إِلَٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفاً لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفاً (طٰہٰ/۹۷) (اور اب اپنے اس معبود کو بھی دیکھ لے جس پر تو ڈیرہ جمائے ہوئے تھا، ہم اس کو پہلے جلائیں گے، پھر دریا بُرد کر دیں گے) تاکہ بچھڑے کے پجاریوں کو اچھی طرح معلوم ہوجائے کہ اس کے ہاتھ میں خود اپنے لیے کچھ نہیں ہے تو دوسروں کے لیے کیا ہوگا؟! پھر اس بچھڑے کا کام مذکورہ طریقہ پر تمام کر دیا گیا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے زمانہ میں فتح مکہ کے وقت بغیر تاخیر کے وہاں موجود بتوں کا صفایا کر دیا تھا اور کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوا تھا[۲۹]۔

۳۴- گناہ گار اہل فتنہ کے مقاطعہ اور اہل بدعت وفسق و فجور کی جلا وطنی کی مشروعیت۔ سامری کی سزا: قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ۔ (طٰہٰ/۹۷) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے بھی لیت ولعت میں غزوۂ تبوک میں شرکت سے پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ کے سوشل بائیکاٹ کا حکم دیا تھا جو بڑی مؤثر خوفناک سزا تھی[۳۰]۔

حواشی ومراجع

۱۔ البقرۃ/۵۱-۵۳ اور الاعراف/۱۴۸-۱۵۴

۲۔ جمہور کی قراءت لنحرقنه (نون کو پیش، حاء کو زبر اور راء کو زیر) میں مبرد (ریتی سے رگڑنے) یا آگ سے جلانے کا احتمال ہے، ابن وردان عن ابی جعفر کی قراءت لنحرقنه (نون پر زبر، حاء ساکن اور راء پر پیش) ثلاثی حرق کا مضارع بمعنی برد (ریتی سے رگڑنا)، اور ابن جماز عن ابی جعفر کی قراءت لنحرقنه (نون پر پیش، حاء ساکن اور راء پر زیر) أحرق کا مضارع بمعنی آگ سے جلانا، مذکورہ تینوں وجوہ میں جمع اس طرح ممکن ہے کہ آگ سے جلا کر پھر ریتی سے رگڑا گیا ہو یا اس کے برعکس۔
محمد بن خلیل القباقبی (وفات ۸۴۹ھ)، تحقیق: احمد خالد شکری، ایضاح الرموز و مفتاح الکنوز فی القراء ات الاربع عشر، دار عمار، عمان، ۱۹۹۶ء، ص ۵۲۶

۳۔ محمد بن جریر الطبری، جامع البیان عن تأویل آی القرآن، مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، طبع سوم، ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء، ۱۶/ ۱۹۵-۲۰۹۔ الفخر الدین محمد بن عمر الرازی (وفات ۶۰۶ھ)، التفسیر الکبیر، کمپیوٹرائز کاپی، مکتبہ الشاملہ، ۱۱/ ۱۵-۳۷ محمد بن احمد القرطبی، (وفات ۶۷۱ھ)، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، ۱۱/ ۱۵۵-۱۶۱ محمد سید طنطاوی، التفسیر الوسیط، کمپیوٹرائز نسخہ، موقع مؤسسۃ آل البیت، اردن، www.altafseer.net اور التفسیر المنھجی مجموعۃ من المؤلفین، بحوالہ المحتوی تفسیر سورہ طه، اعداد احمد شکری، دار المنھل، عمان، ۱۱/۱۶۲-۱۶۹

۴۔ اس قصہ کے اختلافی مسائل یہ ہیں:
☆ سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۸۳ میں قوم موسیٰ کا ذمہ دار کون ہے؟
☆ سامری حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا یا کسی اور قوم سے؟
☆ بنی اسرائیل نے زیورات کیسے حاصل کیے؟

☆بنی اسرائیل کے معبود بچھڑے کی کیا کیفیت تھی؟

☆حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی میں حضرت ہارون علیہ السلام نے کیا کیا؟

☆سامری کی سزا کی نوعیت کیا تھی؟

☆بچھڑے کا خاتمہ کیسے ہوا؟

۵۔ محمود بن عبداللہ الآلوسی (وفات ۱۲۷۹ھ)، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبہ الشاملہ، التحریر والتنویر لابن عاشور، ۱۶/ ۲۷۹-۲۸۰ صلاح عبدالفتاح الخالدی، القصص القرآنی: عرض وقائع وتحلیل أحداث، دارالقلم، دمشق/ الدار الشامیۃ، بیروت ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء، ۳/ ۱۶۰-۱۶۱ محمد الفقی، قصص الأنبیاء: أحداثها و عبرها، مکتبہ وہبہ، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، ص ۳۰۴

۶۔ عبدالوہاب النجار، قصص الأنبیاء، دارالفکر بیروت، ص ۲۲۴ أسماء و أسرار، لبسّام جرار، بحوالہ مقالہ عبدالرحیم الشریف- www.ten.naruqla_nayab

۷۔ عبدالوہاب النجار، قصص الأنبیاء، ص ۲۱۸ محمد بیومی مہران، دراسات تاریخیۃ من القرآن الکریم، دارالمعرفۃ الاسکندریۃ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۵۰-۳۵۵

۸۔ متعدد اقوال وروایات کا خلاصہ از جامع البیان للطبری، ۱۶/ ۲۰۰، ۲۰۵ الجامع لأحکام القرآن للقرطبی، ۱۱/ ۱۵۶ عبداللہ بن عمر البیضاوی (وفات ۹۶۱ھ) انوار التنزیل و اسرار التأویل، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبہ الشاملۃ محمد الفقی، قصص الأنبیاء أحداثها و عبرها، ص ۳۰۴

۹۔ جامع البیان للطبری، ۱/ ۲۸۱، القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۱/ ۱۵۶ اسماعیل بن عمر بن کثیر (وفات ۷۷۴ھ)، تحقیق: احمد ابراہیم زہوۃ، قصص القرآن الکریم، دارالکتاب العربی، ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۴ء، ص ۲۶۶

۱۰۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۱/ ۱۵۶، عبدالوہاب النجار، قصص الأنبیاء، ص ۲۲۰، مفضل حسن عباس، قصص القرآن الکریم، دارالفرقان، عمان، ۱۴۲۰ھ/ ۲۰۰۰ء، ص ۵۷۰

۱۱ عبدالوہاب النجار، قصص الأنبیاء، ص۲۲۰، محمد بیومی مھران، دراسات تاریخیة من القرآن الکریم، ص۳۵۲

۱۲ محمد حسین الطباطبائی (وفات ۱۹۸۲ء) المیزان فی تفسیر القرآن، مؤسسۃ العلمی، بیروت، طبع دوم ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء، ۱۴/۲۰۴

۱۳ ابن عاشور، التحریر و التنویر، ۹/۱۱۰، صلاح الخالدی، القصص القرآنی، ۳/۱۷۵

۱۴ الفخر الرازی، التفسیر الکبیر، ۲۱/۳۵، محمود بن عمر الزمخشری (وفات ۵۳۸ھ) الکشاف عن حقائق التنزیل و عیون الأقاویل فی وجوہ التأویل، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبہ الشاملۃ، ابن عاشور، التحریر و التنویر، ۱۶/۲۹۶، الطباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ۱۶/۱۹۶، عبدالوہاب النجار، قصص الأنبیاء، ص۲۲۰، سید قطب، فی ظلال القرآن، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبہ الشاملۃ، الطنطاوی، التفسیر الوسیط، کمپیوٹرائز نسخہ، مفضل حسن عباس، قصص القرآن الکریم، ص۵۷۰، سعید اللحام، قصص القرآن الکریم، دار مکتبۃ الہلال، ۱۹۸۷ء، ص۱۵۱، زاہیۃ الدجانی، احسن القصص بین إعجاز القرآن و تحریف التوراۃ، دار التقریب بین المذاہب الاسلامیۃ، بیروت، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء، ص۱۵۸

۱۵ سلیمان بن الأشعث (وفات ۲۷۵ھ)، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب لزوم الساقۃ، نمبر حدیث ۲۶۳۹، خلیل السہارنفوری، بذل المجہود فی حل سنن ابی داؤد، مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی، الہند، ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء، ۹/۲۳۳-۳۳۴

۱۶ ابن عاشور، التحریر و التنویر، ۱۶/۲۸۱

۱۷ یہ نافع، ابن کثیر، ابن عامر، حفص عن عاصم اور رویس عن یعقوب کی قراءت ہے، (ایضاح الرموز للقباقصی، ص۵۲۵)

۱۸ باقی عشرۂ مشہور قراء کی قراءت (مرجع سابق)

۱۹ صلاح الخالدی، القصص القرآنی، ۳/۱۶۷

۲۰ محمد بن اسماعیل البخاری، (وفات ۲۵۶ھ) الجامع الصحیح، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبہ

الشاملۃ، باب: جعلت لی الأرض مسجدا و طهوراً
مسلم بن الحجاج النیسابوری، (وفات ۲۶۱ھ)، الجامع الصحیح، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبۃ الشاملۃ
۲۱ فخر الدین الرازی، التفسیر الکبیر، ۲۱/ ۲۸
۲۲ الزمخشری، الکشاف، کمپیوٹرائزنسخہ
۲۳ احمد بن حنبل (وفات ۲۴۱ھ)، المسند، حدیث نمبر: ۲۳۲۰، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبۃ الشاملۃ
۲۴ وہبۃ الزحیلی، التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنهج، دار الفکر المعاصر، بیروت/ دار الفکر، دمشق، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء، ۱۶/ ۲۷۷
۲۵ محمد الأمین الشنقیطی (وفات ۱۳۹۳ھ)، اضواء البیان فی إیضاح القرآن بالقرآن، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبۃ الشاملۃ
۲۶ فخر الدین الرازی، التفسیر الکبیر، ۲۱/ ۳۰
وہبۃ الزحیلی، التفسیر المنیر، ۱۶/ ۲۷۷
۲۷ اسماعیل بن عمر بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳/ ۱۵۹، کمپیوٹرائزنسخہ، مکتبۃ الشاملۃ
ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱۶/ ۲۹۲
۲۸ حمزہ، کسائی اور خلف نے مخاطب کی تاء سے تبصروا پڑھا ہے، باقی نے غائب کی یاء سے پڑھا ہے۔ (القباقبی، ایضاح الرموز، ص ۵۲۶)
۲۹ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۴۱۷
۳۰ نفس مصدر، ۲/ ۵۳۱-۵۳۵
(سہ ماہی آفاق الثقافۃ والتراث، دبئی، ۱۶/ ۶۳، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۶-۱۸)

☆☆☆

مدارس میں اصول تفسیر وعلومِ قرآن کا نصاب - ایک جائزہ

اشہد رفیق ندوی

قرآن مجید کی تعلیم و تدریس کا ایک ناگزیر حصہ اصول تفسیر وعلوم قرآن ہے۔ تدریس کے بنیادی اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ جو علوم متن (Text) پر مبنی ہوں اس کے متن کی تاریخ، اسلوب بیان، تاریخی پس منظر اور مصنف کے فکر ومزاج سے طلبہ کو پہلے آشنا کرادیا جائے، تاکہ وہ متن سے کما حقہ استفادہ کرسکیں اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی سے پہلے اس میں پوشیدہ لعل وگہر تک رسائی کے امکانات کے ساتھ اس راہ کے خطرات سے بھی آگاہ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کے علماء، ائمہ، مفسرین اور محققین نے سب سے مہتم بالشان متن یعنی طلبہ قرآن کے لیے چند بنیادی علوم کو لازم قرار دیا ہے جو فہم متن میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور اس راہ کی مشکلوں کو آسان بناتے ہیں۔ ان علوم کی فہرست بہت طویل ہے۔ اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی فہرست بنائی جائے تو درج ذیل عناوین پر مبنی ہوگی:

(الف) ☆ عربی زبان، اسالیب، اعجاز اور بلاغت وغیرہ بالخصوص جاہلی ادب اور اس کے پس منظر کا مطالعہ۔

☆ حدیث کی تاریخ، روایت ودرایت، اصول وقواعد اور اس کی تفسیری و تشریعی حیثیت سے واقفیت۔

☆ اصول دین اور بنیادی عقائد سے واقفیت۔

☆ فقہ اور اس کے اصول وقواعد نیز تاریخ سے واقفیت تاکہ آیات سے احکام کا استنباط کرنے اور اس کے مراتب متعین کرنے میں آسانی ہو۔